© rasailojaraid.com

تاریخ نے دم توڑ دیا

محمد عابد رحمت

''میں آپ کی شخصیت پر مضمون لکھنا چاہتا ہوں'' میں نے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا' وہ کہنے لگے ''نہیں تم رہنے دو اور بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے ہیں' بس اتنا ہی کافی ہے تم کچھ اور علمی کام کرو' میں نے کہا ''یہ بھی تو ایک علمی کام ہے'' تو اس پر وہ بطور مزاح کہنے لگے یہ علمی نہیں فلمی کام ہے۔ لیکن میں نے اصرار کیا اور جاتے ہوئے بھی میں نے ان سے کہا کہ مضمون لکھ کر آپ کو دکھاؤں گا' انہوں نے کہا ''چلو ٹھیک ہے''۔ یہ میری ان سے آخری گفتگو تھی جب وہ مجھے اپنے گھر سے الوداع کر رہے تھے۔ اپنی وفات سے چند دن قبل مولانا فاروق الرحمٰن یزدانی صاحب کو فون کیا اور میرے بارے میں پوچھا کہ عابد کافی دنوں سے آیا نہیں اور ساتھ ہی انہوں نے مجھے سلام بھیجا اور یہ سلام بھی میرے لئے ان کا آخری سلام تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ پیپر ختم ہوتے ہی سیدھا ان کے ہاں حاضری دوں گا اور ان کی زیارت کروں گا' آج جب کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں' وہ اب اتنے دور چلے گئے ہیں کہ جب تک میں خود دنیا سے دور نہ ہو جاؤں ان سے گفتگو نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان کی زیارت کر سکتا ہوں' ہاں میں نے ان کی زیارت تو کی اور بوسا بھی لیا مگر اس حالت اور کیفیت میں کہ نہ وہ مجھ سے کلام کر سکتے تھے' نہ وہ مجھ سے ہاتھ ملا سکتے تھے اور نہ ہی وہ مجھے گلے لگا سکتے تھے۔ میری آنکھوں میں بہتے آنسوؤں کو وہ پونچھ نہیں سکتے تھے' میں ان کے گھر سے مسجد تک ان کی چارپائی کو کندھا دیتا آیا تھا مگر انہوں نے مجھ سے یہ تک نہیں کہا کہ اگر تھک گئے ہو تو کسی اور کو آنے دو' وہ ہر دم ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ ہر کسی سے ملتے مگر آج جب میں ان سے ملا تو ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا' مجھے مسکراہٹ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی' میں نے چہرہ بھی بڑی مشکل سے ہجوم میں گھس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دھکے کھاتے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو میں جب ان کے ہاں جاتا تو وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر مجھ سے محوِ گفتگو ہوتے مگر آج وہ میری طرف دیکھ تک نہیں رہے تھے‘ پہلے...... وہ مجھے الوداع کیا کرتے تھے مگر آج میں انہیں الوداع کر رہا تھا‘ جن کی زباں پر کبھی تاریخ رواں رہتی‘ تاریخی جھروکوں سے قرطاس کو زینت بخشتے‘ اپنے قلم سے شخصیات پر پھولوں کی برکھا برساتے آج وہ خود تاریخ کا حصہ بن گئے۔ میں اسی تاریخ کو قرطاس پر مشتمل کر رہا ہوں‘ آج میں اپنے قلم کو اسی شخصیت سے روشناس کروا رہا ہوں۔

میرے اس قلم کو نہ جانے پہلے کیا ہوا تھا کہ ان کی سانسوں کی ڈوری ٹوٹنے سے پہلے جنبش نہ کر سکا مگر آج یہ میرے ہاتھ میں آنے کے لیے بے قرار رہے‘ میرے درد کو شاید یہ خود میں سموئے بیٹھا تھا‘ غم واندوہ کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹے ہیں مگر آنسو الفاظ کی صورت میں اس کے نکل رہے ہیں۔ ان کی شخصیت پہ کچھ لکھتے ہوئے آنکھیں نم‘ دل غمگین اور ہاتھ کانپ رہے ہیں لیکن قلم ہے کہ مسلسل مچل رہا ہے‘ قلم کے قرطاس کو چھوتے ہی یادوں کے بند دریچے کھلتے جا رہے ہیں۔

ان کی بولتی آنکھیں‘ مسکراتا چہرہ‘ میانہ قد‘ سست روچال‘ سادہ مگر صاف ستھرا لباس‘ سادگی میں لپٹی ہرا ادا‘ کانوں میں رس گھولتی کمزور اور نحیف مترنم آواز‘ بلا توقف علم کے موتی بکھیرتا ان کا قلم‘ اس قلم کو چلاتے ان کے ماہر مگر کانپتے ہاتھ‘ ان ہاتھوں کی راہنمائی کرتا قوی حافظہ‘ اس حافظے کے تخلیق کردہ علم کے وہ جواہر پارے جو دل و دماغ پر اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ جائیں‘ میدان تحریر کے شہسوار ایسے کہ ہم عصر اہل قلم اور دانشور بھی عش عش کر اٹھیں‘ خاکہ نگاری کی یہ انتہا کہ پورے کا پورا انسان ہی سامنے لا کھڑا کریں‘ الغرض ان کا تصور نقشہ لوح قلب و دماغ پر ایسا مرتسم ہو چکا ہے گویا کہ وہ بقید حیات ہوں‘ ان کی خندہ پیشانی سے ملنے کی ادا اور ہشاش بشاش چہرے کی وہ تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔

مہمان نوازی میں مماثل ابراہیم 9 اور اخلاق حسنہ میں نبی کریمؐ کے پیرو‘ گمنام ایسے کہ اپنے تک ان کے مقام سے ناآشنا اور نامور ایسے کہ انہیں جانے بغیر تاریخ اہل حدیث ادھوری ٹھہرے۔

یہ میرے محترم بزرگ‘ میرے راہنمائے تحریر اور مشفق استاذ‘ مؤرخ اہل حدیث‘ مصنف کتب کثیرہ‘ آبروئے قلم و قرطاس‘ غزالی دوراں‘ عظیم دانشور‘ محقق دوراں‘ جنگ آزادی کے غازی‘ آزادی کی خاطر پابندی سلاسل سے آشنا‘ سیاست و صحافت کے منصۂ شہود پر ابھرنے والے درخشندہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ستارے' مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانیؒ کے شاگرد خاص' مولانا داؤد غزنویؒ' مولانا اسماعیل سلفی اور مولانا حنیف ندویؒ کے سایہ شفقت میں 15 سال سے زائد کا حسین عرصہ بتانے والے' یہ مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ ہیں محبت والفت' چاہت واخوت' اخلاص ومروت' پیار واظہار کے امتزاج کامل کے وہ پیکر مجسم تھے' ان میں ہر ایک کے لئے بلا امتیاز وفا کی چاشنی کا عنصر ہر آن نمایاں و غالب تھا' جن کی رفاقت میں گزرے ہوئے وہ حسین اور یادگار لمحات میرے لئے باعث صد افتخار و نازش ہیں۔ ان پر ہزاروں مصائب وآلام کے پہاڑ ٹوٹے' غربت وافلاس نے کمر توڑ ڈالی مگر مجال ہے کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا ہو' ہاں اگر کشکول لئے کسی کے در پہ دستک دی تو فقط اہل علم اور اسلاف کی حیات کے مہکتے گوشوں کے لئے تاکہ وہ ان کے تذکار کو تاریخ وصفحات میں سمو کر اس امانت کو حیات جاوداں کے سپرد کر دیں' تن تنہا بنا کسی کی مالی معاونت کے ایک ادارے سے بڑھ کر ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ عقل محو تماشا ہے لب بام ابھی۔

ان کی وفات کی خبر سنتے ہی دل ودماغ پر ایک سوال ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا کہ ''کیا تاریخ بھی کبھی مرتی ہے؟''۔ اس تلخ حقیقت نے مجھے باور کروایا کہ ''ہاں! آج تاریخ نے دم توڑ دیا''۔ مجھے اس حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا کیونکہ اسی صد سالہ تاریخ کو' اس ایک صدی کو ہم نے اپنے ہی ہاتھوں منوں مٹی تلے دفن کیا۔ ہمیں حقیقی تاریخ اور اپنے اسلاف سے جوڑنے والا' ہماری تاریخ کے بکھرے شیرازے کو یکجا کرنے والا وہ آفتاب جو 1925ء میں ہندوستان کے مطلع سے طلوع ہوا اور آزادی کے بعد سرزمین پاکستان میں 90 سال 9 ماہ 7 دن اپنی پوری آب وتاب سے چمکتا ومکتا رہا اور اپنی تجلیاں اور تابانیاں جہان علم میں بکھیرتا رہا بالآخر یہ آفتاب 22 دسمبر صبح 5.30 بجے نمونیہ کی وجہ سے جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس آفتاب کے خاک کی اوٹ میں چھپتے ہی غم کے بادلوں نے ہلہ بول دیا' اداس فضاء نے ہر ذی روح کو اداس کر ڈالا' اشکبار آنکھوں نے اس پر آخری نگاہ ڈالی اور پھر وہی ہوا جو ہر انسان کے مقدر میں ہے۔ اب ہم تاریخ پوچھیں تو کس سے؟ ہم متلاشی نگاہیں لئے کسی ایسے مسیحا کے منتظر ہیں جو ہمیں تاریخی آئینہ میں ہماری شناخت کروا سکے ہاں ہم منتظر ہیں۔

© rasailojaraid.com